R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۲	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۸ رجنوری ۱۹۶۷ء

اداریہ

ہندوستان کے اُردو شاعروں سے

ایک خط میں ہم سے پوچھا گیا ہے:۔

"پاکستانی شعرا گیت پر اور ہندی کے الفاظ کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر کیوں زور دے رہے ہیں جبکہ ہندوستان کے اردو شاعر ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ اکتوبر کے "تحریک" میں کرشن موہن کی ایک غزل جس میں چند الفاظ ہندی کے تھے اس کو ہندی غزل کا نام دے دیا گیا جبکہ ناصر شہزاد (پاکستان) کے یہاں اس قسم کی کئی غزلیں ہیں اور نظموں میں تو ہندی الفاظ کی بہتات ہے ہندی رسم الخط میں لکھنے کے بعد ان کو ہندی نظم ہی کہا جائے گا۔ ہندی الفاظ، ہندی تشبیہات کا استعمال دل کھول کر کیا ہے ہندی میں جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں بھی زیادہ سے زیادہ ہندی شعرا عربی فارسی کے الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔ نہ صرف غزلوں بلکہ ہندی کے شعرا گیتوں میں بھی عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور فخر یہ بتاتے ہیں کہ ہم عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی روح کو سمجھتے ہیں۔ ایک گیت کے بول ملاحظہ ہوں:۔

کارواں گزر گیا، غبار دیکھتے رہے

نیرج کے گیت کو کون ہندی گیت کہے گا لیکن بعض ہندوستانی اردو شعرا اس کی طرف زیادہ راغب نہیں۔ کیوں؟

پاکستان میں گیت اتنی ترقی کیوں کر رہا ہے۔ جبکہ ہندوستان میں گیت کی صنف کو صرف منہ کا مزا بدلنے کی چیز سمجھا جا رہا ہے؟"

چونکہ اس خط میں بعض اہم مباحث چھیڑے گئے ہیں، اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ "ہماری زبان" کے پڑھنے والوں کو بھی اس بحث میں شریک کرلیں۔ خط کے اہم اجزا یہ ہیں:۔

(۱) پاکستانی شعرا گیت پر اور ہندی کے الفاظ کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر کیوں زور دے رہے ہیں؟

(۲) ہندوستان کے اردو شاعر ہندی کے الفاظ کیوں زیادہ استعمال نہیں کرتے؟

(۳) ہندی میں جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں عربی فارسی کے الفاظ ڈھونڈھ کر لائے جاتے ہیں۔

(۴) ہندی کے شعرا گیتوں میں بھی عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔

(۵) پاکستان میں گیت اتنی ترقی کیوں رہا ہے جبکہ ہندوستان میں اسے صرف منہ کا مزا بدلنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔

اب ہر بات کا مختصر جواب ملاحظہ کیجیے:۔

(۲،۱) ہندوستانی یا پاکستانی شعرا کے یہاں ہندی کے الفاظ کی کثرت یا قلت کے متعلق فیصلہ صرف چند شعرا کی مثال سے نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح طریقہ کار یہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان کے ایک درجن ممتاز شعرا کے کلام کو دیکھ کر ان میں الفاظ کے استعمال کے متعلق رائے دی جائے۔ پھر بھی ہمارا خیال یہ ہے کہ پاکستان میں ہندی کے الفاظ کے استعمال کی تحریک آگے بڑھ رہی ہے اور خاصی تعداد میں شعرا ہندی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی پہلے سے زیادہ ہندی کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں، مگر ہندوستان کے شعرا کے سامنے زبان کی حفاظت کا سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے اور ان میں سے بیشتر اس وجہ سے پاکستان کے شعرا کی سی آزادی نہیں برت پاتے پھر پاکستان میں جہاں ابن انشا اور ناصر شہزاد جیسے شاعر ہیں جو ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں وہاں عبدالعزیز خالد جیسے شاعر بھی ہیں جو عربی فارسی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں گو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض الفاظ سلیقے سے بھی استعمال کیے ہیں۔ دراصل ہندی کے الفاظ کم یا زیادہ برتنے کا سوال اتنا اہم نہیں، شاعری کی زبان کا سوال زیادہ اہم ہے۔ ہماری شاعری کی زبان ہماری بول چال کی زبان سے خاصی دور رہی ہے۔ جدید دور میں اسے بول چال کی زبان سے قریب لانے کی کوشش شروع ہوئی ہے اور اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ پھر روایتی سانچوں کو توڑ کر اظہار کے نئے پیرائے تلاش کرنے اور کبھی کبھی پرانے پیرایوں کی بازیافت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس لیے پاکستان میں جو تجربے اس سلسلے میں ہو رہے ہیں ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں بھی ایسی کوششیں ہوئی ہیں گو اس معاملے میں شاید پاکستان ہم سے آگے

ہے ہمیں اپنی شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانا چاہیے اور اظہار کے سانچوں کے سلسلے میں بھی تجربوں کی لے بڑھانی چاہیے۔ اس کوشش میں ہندی کے الفاظ سے قدرتی طور پر زیادہ مدد ملے گی۔

ایک بات اور یہاں قابل ذکر ہے۔

مجموعی طور پر ہماری شاعری خطابیہ زیادہ ہے، جس کے لیے فارسی الفاظ سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ جب اس میں اپنے من کی موج یا خود کلامی یا اپنے جذبات کے اظہار کی کیفیت بڑھے گی تو اس کا اسلوب اور بدلے گا۔ پھر اس میں موقع موقع سے ہندی کے الفاظ زیادہ ہوں گے کسی مخصوص سیاسی مقصد کے لیے ہندی کے الفاظ لانے کا مسئلہ ہمارے نزدیک اتنا اہم نہیں، خالص ادبی نقطۂ نظر سے اور اپنے سارے سرمایۂ الفاظ سے کام لینے کی خاطر ہندی الفاظ کا اور زیادہ استعمال ناگزیر ہے۔

(باقی آیندہ)

برطانوی لائبریریوں میں ہندستانی زبانوں کی کتابیں

لندن۔ انگلش مڈلینڈز کے صنعتی شہر کوونٹری میں ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کی بہت مانگ ہے۔ چنانچہ اس شہر کی لائبریریاں اب ہندوستان سے کتابیں منگوانے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ان لائبریریوں میں ہندوستانی زبانوں کی جو کتابیں ہیں ان میں ۵۰ پنجابی اور ۲۰ ہندی، اردو اور گجراتی کی کتابیں شامل ہیں۔ کوونٹری کی لائبریریوں کے ڈائریکٹر نے بتایا ہے کہ انڈیا ہاؤس نے مختلف ہندوستانی زبانوں کی ۳۰ کتابوں کی فہرست چھپائی ہے جس کی بنیاد پر ہندوستان سے نئی کتابیں خریدی جائیں گی۔ مذکورہ پنجابی کتابیں کوونٹری میں رہنے والے ایک ہندوستانی باشندہ نے دی تھیں۔

(سنگم، پٹنہ)

بی۔ بی۔ سی کالج میں اردو کے لکچرار کا تقرر

دھرم پور (مدن پور) سے جناب عرفان رضوی اطلاع دیتے ہیں کہ بی بی سی کالج آسنسول میں اردو کے لکچرار کی بحالی ہو چکی ہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۹۷ء سے اردو کی پڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ اس کے لیے اردو طلبا کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی ہے جس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

(سنگم، پٹنہ)

پٹیالہ میں ادیبوں اور مصنفوں کی بستی

پٹیالہ۔ پنجاب کے مشہور ادیبوں نے یہ تحریک شروع کی ہے کہ پنجابی یونیورسٹی کے نزدیک ادیبوں اور مصنفوں کی ایک بستی آباد کی جائے۔ اس مقصد کے لیے زمین اور دیگر سامان حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ حکومت سے مدد چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے چنڈی گڑھ میں صحافیوں کی ایک بستی تعمیر کی جا چکی ہے۔

مراٹھی شاعر کو اعزاز

نئی دہلی۔ بہار، ہندوستانی ادب کے خالق کے سلسلے کے تحت ساہتیہ اکیڈمی کے مخصوص موضوع کے پہلے دو جریدے جاری کیے جائیں گے مرکزی وزیر داخلہ مسٹر راؤ ان کا اجرا کریں گے۔ ان میں سے ایک جریدہ انگریزی کا ہوگا اور دوسرا ہندی کا۔ یہ جرائد جدید مراٹھی شاعری کے بانی کیشو ست سے متعلق ہیں۔ کل ملک بھر میں ان کی صد سالہ یوم پیدائش منائی جائے گی۔

(قومی آواز، لکھنؤ)

احمد آباد میں "جشن مظہر" کی تیاریاں

احمد آباد کے ممتاز ادیب اور مترجم جناب مظہر الحق صاحب علوی نے انگریزی کے کئی مشہور ناولوں کا اردو زبان میں بڑی خوبصورتی و روانی سے ترجمہ کرکے اردو کے تفریحی ادب میں شاندار اضافہ کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو احمد آباد نے فیصلہ کیا ہے کہ جشن مظہر کے سلسلے میں ایک عام مشاعرہ تفریحی ادب پر سمپوزیم نیز اردو میں ترجمے کے مسائل پر مقالات و تقریروں کا پروگرام ہوگا۔

(نامہ نگار)

"مجلۂ سیفیہ" بھوپال

سیفیہ کالج بھوپال کا اردو میگزین "مجلۂ سیفیہ" برائے ۱۹۹۶۔۱۹۹۷ء عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ مجلہ میں مختلف موضوعات پر گرانقدر مضامین شامل ہیں۔ معاونین میں راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر ابو محمد سحر، مولانا حبیب ریحان استاد جامعہ اسلامیہ لیبیا، ڈاکٹر سید حامد حسین، ذکی الرحمن خاں عزیز انصاری، سید حیدر عباس رضوی، محمد شریف خاں، اخلاق اثر، احسن علی خاں ندوی، سید ظہیر الاسلام، محمد کمال پاشا ذکی، عبد القوی دسنوی شامل ہیں۔

دکنی رباعیاں

اردو کی ممتاز محقق اور صاحب طرز تنقید نگار ڈاکٹر سیدہ جعفر نگراں اردو نظام کالج حیدرآباد کی نئی کتاب "دکنی رباعیاں" کے نام سے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

ادیبوں اور مصنفوں کی کل ہند کانفرنس

لکھنؤ۔ مارچ کے پہلے ہفتے کے دوران الہ آباد میں ادیبوں کی ایک آل انڈیا کانفرنس ہوگی جس میں جدید ادب سے متعلق مسائل پر غور کیا جائے گا۔ اس کا اہتمام ایک ادارہ "پرگتی" کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

ایک نئے رسالہ کا اجرا

ہفت روزہ ادارۂ اشتراک کی جانب سے جلد ہی ایک ماہی رسالے کا اجرا ہونے والا ہے۔ اور اس سلسلے میں کام شروع کر دیا ہے۔ ہفت روزہ "اشتراک" اور اس کے اداروں سے نکلنے والے ماہی رسالہ کے لیے تخلیقات وغیرہ ہفت روزہ "اشتراک" قاضی پور خورد گورکھپور کے پتہ پر ارسال کی جا سکتی ہیں۔

(ایم کوثر صدیقی، رانچی)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قمر زمانی بیگم

یکم راکتوبر ۲۰۰۲ء کے "ہماری زبان" میں "قمر زمانی" کے عنوان سے جناب ایس نورالحسن ادیب کا ایک مراسلہ بطور استفسار شائع ہوا ہے۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ مجنوں گورکھپوری اور مالک رام صاحب دونوں نے صحیح لکھا ہے کہ قمر زمانی بیگم کے روپ میں نیاز فتح پوری ہی تھے اور بائیں ہاتھ سے خط لکھ کر شاہ دلگیر مدیر نقاد کی خدمت میں بھیجتے تھے لیکن یہ خیال کہ قمر زمانی کے نام سے کسی پردہ پوش نے چلمن کے پیچھے دست نگارین دکھایا تھا اور دلگیر پر اسی وقت یہ راز فاش ہو گیا تھا درست نہیں ہے۔ شاہ دلگیر نیاز صاحب کے "یاران نجد" میں شامل تھے۔ انھوں نے جنوری ۱۹۱۳ء میں آگرے سے نقاد جاری کیا اور اس آن بان سے کہ وہ بہت جلد اس وقت کی علمی و ادبی دنیا کی توجہ کا مرکز اور معاصر پرچوں کا حریف بن گیا۔ یہ پرچہ اپنے دور اول میں مارچ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا اس کے بعد مالی مشکلات کے سبب بند ہو گیا۔

نیاز فتح پوری اور ان کے احباب خلوص دل سے یہ چاہتے تھے کہ "نقاد" از سر نو جاری کیا جائے اور شاہ دلگیر کو اس طرف توجہ دلائی جائے "یاران نجد" کے کہنے سے جب دلگیر صاحب رضامند نہ ہوئے تو انھوں نے دلگیر کی طبیعت کا اندازہ کرکے ان کو اکسانے اور ان کی بے دلی کو خوش دلی میں بدلنے کے لیے ایک ترکیب نکالی اور وہ ترکیب یہ تھی کہ ۳ر نومبر ۱۹۱۵ء کو نیاز صاحب نے قمر زمانی بیگم کے فرضی نام سے دلگیر کو دہلی سے ایک خط لکھا۔ یہ خط بائیں ہاتھ سے لکھا گیا تھا اور اس کی پیشانی پر یہ شعر درج تھا

"میری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے
زندگی آج تک حسرت ہی وہ حسرت بھرا دل ہو گیا"

اس کے بعد اصل مضمون یہ ہے

"جناب اڈیٹر صاحب نقاد تسلیم

"آپ اس خط کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ لکھنے والی کون ہے اور یہ بھدا خط کس کا ہے۔ لیجیے سنئے! بھائی جان قبلہ کے پاس عرصے تک نقاد آتا رہا چوری چھپے میں بھی اسے دیکھ لیتی تھی ماشاء اللہ کیا طرز تحریر ہے اور کیا پیارا کلام ہے۔ مگر حیران تھی کہ مجھ کمبخت سے بھی زیادہ کوئی دکھا ہوا دل رکھتا ہوگا۔ میں شاعرہ نہیں ہوں لیکن تھوڑا مذاق سخن ضرور رکھتی ہوں، جو میرے تڑپانے کے لیے کافی ہے شاعروں کی سخن وری کی داد دے سکتی ہوں اور نہ اپنی سخن فہمی کی داد چاہتی ہوں عالمگیر کی بیٹی زیب النسا کی طرح میری زندگی بھی بسر ہو رہی ہے۔ خیر اس ذکر کو چھوڑیے، اب آپ یہ بتائیے کہ اگر کوئی دکھیا آپ سے ملنا چاہے تو کیونکر ملے، آپ بڑے آدمی ہیں، شاعر ہیں، ایک مشہور شخص ہیں آپ کی بلا سے۔ مگر نہیں اگر سچ مچ آپ دنیا ہی درد مند دل پہلو میں رکھتے ہیں جیسا کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے تو یقین ہے کہ آپ ۷ر نومبر کی شب دہلی تشریف لا کر احمد بھائی کے .... میں کسی بالاخانے میں قیام کریں وہاں یا تو میں خود حاضر ہوں گی یا میری خادمہ "پیاری" (اس کا نام ہے) میرا خط لے کر آپ کی خدمت میں دس بجے رات کو حاضر ہوگی اور سواری ساتھ لائے گی۔ اگر آپ تشریف لا کر میری عزت بڑھائیں تو میں بہت شکر گزار ہوں گی یہ تاریخ خاص کر اس لیے مقرر کی ہے کہ اس دن میرے عزیز و اقارب باہر چلے جائیں گے اور گھر میں سوائے میری خادمہ کے اور کوئی نہ ہوگا نقاد میں آپ کی تصویر دیکھ چکی ہوں لیکن اب سامنے بیٹھ کر آپ سے حال دل کہنے کو دل چاہتا ہے۔ للہ عذر نہ کیجیے پھر خدا جانے کب موقع ملے یا نہ ملے کیونکہ میں بہت جلد بنارس جانے والی ہوں"

قمر زمانی"

ضیا عباس ہاشمی اور نیاز صاحب بتایا کرتے تھے کہ شاہ دلگیر نہایت خوبرو اور وجیہ آدمی تھے اور انھیں بہت پہلے سے یہ مغالطہ تھا کہ رنگین ان کی رومان پرور انشاپردازی پر جان چھڑکتی ہیں۔ چنانچہ یہ خط ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ شاہ دلگیر قمر زمانی سے ملنے کے لیے دہلی پہنچ گئے۔ نیاز صاحب اور ان کے احباب کو جب یہ معلوم ہوا کہ دلگیر صاحب واقعی تشریف لے آئے ہیں تو سوال یہ سامنے آیا کہ "قمر زمانی بیگم" کہاں سے پیدا کی جائیں؟

ضیا عباس ہاشمی صاحب کے عزیزوں میں محمد احمد صاحب جن کا انتقال اب سے دو سال پہلے ہوا ہے چھریرے بدن کے خوبصورت آدمی تھے اور زنانہ لباس میں انھیں شناخت کر لینا آسان نہ تھا چنانچہ کوئی برقعہ پوش خاتون نہیں بلکہ محمد احمد مرحوم قمر زمانی کے روپ میں دلگیر صاحب سے ملنے گئے تھے مبادا راز فاش نہ ہو جائے اس لیے چہرے سے نقاب نہ ہٹایا اور پردے ہی سے بات چیت کرتے رہے دلگیر صاحب نے نقاب الٹ دینے پر اصرار کیا قمر زمانی بیگم تیار نہ ہوئیں، اس پر ایک لمحے کے لیے دلگیر کو کچھ شبہ ہوا اور وہ اٹھ کر چلے گئے لیکن یہ کیفیت لمحاتی تھی، واپس جانے پر قمر زمانی کے خیال کو تو وہ اپنے دل سے نکال نہ سکے، ادھر قمر زمانی بیگم نے پھر خط لکھ بھیجا۔

"وہ آئے بھی اور اٹھ کے چل بھی دیے
یہ مدت بھی کیا مختصر ہو گئی"

آداب عرض کرتی ہوں!

خوب قدر بڑھائی، خوب ذلیل کیا۔ واہ درد مند دل والے، ایسے ہی تو ہوتے ہیں آخر پھر تکلیف فرمانے ہی کی کیا ضرورت تھی، ملازم کے ہاتھ ہی کہلوا دیا ہوتا کہ ہم نہیں آسکتے "میں کیا کہوں کیسی مجھے شرم آئی اور میں نے کیسی قدر اپنے اوپر ملامت کی۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ آپ ایسی رکھائی برتیں گے تو میں ہرگز گھر سے باہر قدم نہ رکھتی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مجھے برقعہ اتار دینے پر کیوں اس قدر مجبور کیا اور میرے انکار پر آپ کیوں بگڑ گئے اور

چل دیجیے۔
ابھی تو یہ آنکھوں کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ بھی کیسے بے درد ہوتے ہیں خیر ؎

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گی

میں پرسوں دہلی جا رہی ہوں اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ کب تک وہاں رہوں گی۔ اگر آپ کے شان کے خلاف نہ ہو تو اس پتے پر مجھے یہ بتلایئے گا کہ آخر بات کیا تھی۔ پتہ یہ ہے۔
بانس بریلی۔ محلہ ذخیرہ۔ بمعرفت صادق حسین صاحب
لفافے کے اندر میرے نام کا خط دوسرے لفافے میں بند کر کے رکھیے گا۔ میرے خط کے لفافے پر صرف "ق ز" ہونا چاہیے۔

آپ کی خطاوار

ق ز

قمر زمانی کا یہ مکتوب شاہ دلگیر کے حق میں سمند ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا، وہ قمر زمانی کے لیے حد درجہ مضطرب ہوئے خود کو خطاوار و گستاخ اور قمر زمانی کو معصوم و مظلوم خیال کرنے لگے چنانچہ قمر زمانی کو خط کے جواب میں ایک طویل خط اس طور پر لکھا۔

"کیسی معصوم بن رہی ہیں آپ
جان گویا کسی کی لی ہی نہیں

سرکار مجرا عرض ہے۔
دوسرا محبت نامہ ملا، شرمندہ ہوں کیا جواب دوں جس نے آپ کو ذلیل کیا خدا اُسے ذلیل کرے۔ آہ میں تو بے درد ہوں، دردمند دل میرے پاس کہاں، ہوتا تو آپ کو شکایت ہی کیوں ہوتی۔
ہاں سچ ہے ؎

اس دل سے مجھے لاگ ہے بے مہر تو میں ہوں
تم شانِ وفا، کانِ وفا، جانِ وفا ہو

خدا آپ کو باہمہ مہر و محبت سلامت باکرامت رکھے
کیا کروں اپنی کمبخت طبیعت سے مجبور ہوں ؎

نازک مزاج میں بھی ہوں گو نازنیں نہیں

آپ نے جس خلوص و محبت سے مجھے بلایا اور میں بدنصیب چلا آیا اس کے شایانِ شان وہ حجاب نہ تھا جو برتا گیا آپ کو بے تکلف ہو کر ملنا تھا، کیوں کہ دو ٹوٹے ہوئے دلوں میں کوئی بیگانگی اور پردہ نہیں ہوتا میں ایسا بد نظر بھی نہ تھا کہ کوئی گستاخی حسن کی سرکار میں مجھ سے سرزد ہوتی پھر

مشتاق سے شرم ہی سہی، عاشق سے حجاب کیا

اس لیے میں نے آپ سے باادب عرض کیا تھا کہ یہ حجاب نہ رکھیے جو میری بدقسمتی سے قبول نہ ہوا اور میری التجا شاہانہ لب و لہجے میں نامنظور کر دی گئی، ٹھکرا دی گئی ہائے ؎

بات کی تم نے یوں کہ کی ہی نہیں
لطف کیا جب نظر ملی ہی نہیں

اس بیگانگی کی ادا کا مجھ پر فوری اثر ہوا اور میں سمجھا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں، بس یہ خیال مجھ دیوانہ سر کے لیے ہوا تھا جس نے حیف اس قدر جدائی پر مجبور کر دیا ہے ؎

تم سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اس پر آپ نے قیامت کی کہ چلتے وقت نہ آپ نے ہاتھ سے روکا، نہ زبان سے روکا

سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

ورنہ ممکن نہ تھا کہ ایک قدم بھی میں چل سکتا، میں تو مرنے کے ارادے سے گیا تھا اور صبح تک زندہ نہ رہ سکتا، لیکن افسوس!

کبھی یاس ہوتی نہ اپنی امید
تغافل سے تیرے مگر ہو گئی

اور کیوں نہ ہوتی جب دعوت نامے کا زیب عنوان یہ مقطع شعر تھا ؎

میری تقدیر میں دلگیری رہنا مقدر ہے
نہ نکلی آج تک حسرت میں حسرت بھرا دل ہوں

اب تو خوش ہو گئیں ؎

لو وہ بھی تمہارا کہا ہو گیا

آپ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو برا کہیں اور میں شرم ناروا کو ہائے اس ظالم سے خدا سمجھے ؎

شرم جو تیرا بُرا دونوں کا ارماں لے گیا

اُف! شوقِ دل سنانے کا کس قدر ارمان تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ میری غلطی تھی ؎

شوقِ دل تم سے کیا بیان کرتا
کہنے سننے کی بات تھی ہی نہیں

آپ دیکھتیں تو میں دکھاتا ؎

کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اور اسی وقت آپ کو میرے دردمند دل کا حال معلوم ہو سکتا، اب تو میں بے درد ہوں، آپ باور کریں تو میں عرض کروں کہ شوقِ دل سنانے سے زیادہ، آپ کے درد دل سننے کا اشتیاق مجھے کشاں کشاں وطن سے لے گیا اور پھر ایسے زمانے میں جب کہ کوئی گھر سے نہیں نکلتا لیکن آہ اپنی شوریدہ طالعی کو کیا کروں ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(باقی صفحہ ۷ پر)

نئے ورش کا آدرش

کرشن موہن

اک ورش اور دکھا کر اپنا چنچل چہرہ بیت گیا ہے
جیون کچھ کا بیت گیا ہے
جس کا جوبن بھلا بھلا اور سرکش تھا
نس دن گا کر بے تابی کا گیت گیا ہے
شانتی کا میٹھا نغمہ گا نہیں پایا
سچ پوچھو تو اپنی سمجھ میں آ نہیں پایا
جانے والا ورش جو ہم سے
پریت کی ریت نبھا نہیں پایا
ہم جو اس کے چنچل من میں پیار کی نرمی ڈھونڈ رہے تھے
سندرتا کے بے کل رسیا، دیوانے تھے
جلتے دیپ کے پروانے تھے
بجھا دیپ بھی آخر جل کر
خوب مچل کر اپنی جوت کا تیج دکھا خاموش ہوا ہے
ٹھنڈا اس کا جوش ہوا ہے
آج سمے کا اک شعلہ روپوش ہوا ہے
آنے والے ورش سے ہم کو
نرمل چاہت کی آشا ہے
دل کی راحت کی آشا ہے
مانو پریم کی راہ دکھائے آنے والا ورش سبھی کو
حاصل ہو مانوتا کا آدرش سبھی کو
دیش کی بھگتی من کو شکتی شالی کر دے
تازہ خوں رگ رگ میں بھر دے
راہ سے جو بھٹکے ہیں ان کو
آنے والا ورش وفا کی راہ پہ لائے
کانٹے جو کھٹکے ہیں ان کو
یہ پھولوں کا ہار بنائے
نرمتا ادر کومتا سے
آنے والے ورش کے پریم آدرش کی خوشبو
ہرش کا جادو
بن کر ہر اک پرانی کے من پر چھا جائے

وفا

علیم اختر غازی پوری

پوچھو نہ وفا کیا ہے
اک جادۂ بے منزل
اک درد کا صحرا ہے

غزلیں

سلام مچھلی شہری

میں بھی اسی جیون کا درپن مزدور ہوں — ابھی ابھی اندھیارا، ابھی ابھی نور ہوں
ہر ہر سینوں کے ساگر میں گیت ہیں — ٹھہر ٹھہر دنیا! میں نشے میں چور ہوں
تم بھی اسی دھرتی کے چاندی کے پھول ہو — میں بھی اسی دھرتی کی مٹی کا نور ہوں
ذرہ سمجھتے ہوئے بھولو نہ مجھ کو — میں بھی کسی دکھیاری ماں کا غرور ہوں
جیون ہمالہ گلے سے اتار کر — شبدوں کا امرت ہوں، کویتا کا نور ہوں
پھولوں کو روتے ہوئے دیکھا ہے ہم نے — تم تو یہی سمجھو بہت مسرور ہوں
مشہور عالم ہے کوہ کنی جس کی — میں بھی سلام ایسا ہی اک مزدور ہوں

وفا ملک پوری

مجبوریوں ہوئے ستم باغباں سے ہم — لے کر غم بہار چلے گلستاں سے ہم
ہم سے فلک نے لے لیا اس کا بھی انتقام — دو چار دن جو آئے نوازش زماں سے ہم
خون جگر جلا کیا جس کی بہار کو — پامال ہو کے نکلے اسی گلستاں سے ہم
کس نے کیا تباہ دل نامراد کو — کیونکر کہیں یہ بات اب اپنی زباں سے ہم
اب اور کچھ مآل محبت نہ پوچھئے — پامال ہی رہے ستم دوستاں سے ہم
چشم وفا سے اشک نہ بہنے دیا کبھی — جلتے رہے ہیں گرمی سوز نہاں سے ہم
سب دل کی دھڑکنوں سے عیاں ہو گیا وفا — وہ راز کہہ سکے جو نہ اپنی زباں سے ہم

تارا چرن رستوگی طاہر

ذہن احساس کچھ پھرے ہے پریشاں ہو کر — ولولے دل کے رہے باقی طوفاں ہو کر
ایک دنیا کے تصور سے گریزاں ہو کر — کام شیطان کے ہم کرتے ہیں انساں ہو کر
جی لگا رہتا تھا تسخیر غم دوراں میں — زندگی ہو گئی دوبھر مجھے آساں ہو کر
اس کے ہیجان کو رکھا ہی نہیں پیش نظر — ہم نے دیکھا نہیں انجام دل و جاں ہو کر
روشن خاص پہ وہ خود بھی آ جاتے ہیں — دیکھنے لگتے ہیں ہم جن کو پشیماں ہو کر
لحظہ لحظہ جو بڑھے جوش اسے کہتے ہیں — نذر کچھ رہ گیا گزرا ہوا طوفاں ہو کر
ذہن آ کو وہ چھپائے نہ چھپے گا طاہر — خود نمائی پہ دل و جاں ہے قرباں ہو کر

انجم سیتاپوری

ہجوم غم میں رہ کر سر خوشی کی بات کرتے ہیں
بہت چھوٹے ہیں وہ زندہ دلی کی بات کرتے ہیں
ابھی عرفان اپنا بھی انہیں حاصل نہیں لیکن
خدا کی بات کرتے ہیں خودی کی بات کرتے ہیں
کچھ ایسے مدعی بھی ہیں یہاں درک بصیرت کے
اندھیروں میں بھی رہ کر روشنی کی بات کرتے ہیں!
ازل سے جن میں کوئی حسن و حرکت ہی نہیں انجم
وہ پیکر بھی تو ہم سے دلکشی کی بات کرتے ہیں

---------*---------

(صفحہ ۵ سے آگے)

آپ کو معلوم نہیں کہ میں آپ کی صحبت سے کس طرح اٹھا اور اٹھنے کے بعد کیا گزری۔ بس یہ کیفیت تھی

درد کی طرح اٹھے گر پڑے آنسو کی طرح

وہ رات آہ! وہ دلگیر رات، میرے لیے قیامت تھی جس بے چینی اور الم سے صبح ہوئی ہے میرا دل پر اس کا نقش ثبت ہے۔ نہیں خبر میں کیونکر زندہ رہا۔ صبح ہوتے ہی لوگوں نے دیکھا کہ ایک زندہ جنازہ ریل میں سفر کر رہا ہے کاش میں زندہ واپس نہ آتا!!

کیا لکھوں کس قدر مجروح اور دل گرفتہ واپس آیا ہوں آپ کبھی دیکھیں تو دکھاؤں ؎

لاکھوں زخموں پر بھی اک گوشہ سلامت دل میں ہے
یہ جگہ کس کے لیے خالی بھری محفل میں ہے

"کس کے لیے" کی ضمیر جس طرف راجع ہوتی ہے اس کا فیصلہ آپ ہی پر منحصر ہے ؎

تمہیں فیصلہ ٹھہرا گئیں بعد خدا لگتی

میری طبیعت اور آپ کی طبیعت میں بس اتنا ہی تو فرق ہے، آپ فرماتی ہیں چند روز قلق ہونے کے بعد طبیعت سنبھل جائے گی اور مجھ دکھا دوست کی طبیعت کا یہ حال ہے کہ اب حشر تک سنبھلنے والی نہیں ؎

آندھی کی طرح آئی طبیعت جو عراقیؔ

تیرہ ہو تو ہذیانات محبت تھے جو بے ساختہ زبان قلم سے نکل گئے۔ اب میں اپنی بے ادبی، دل شکنی اور گستاخی کی بابت آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے معاف کر دینا ورنہ مر جاؤں گا۔ چاہتا ہوں کہ جب تک حیات مستعار باقی ہے آپ سے یہ خط و کتابت ترک نہ ہو، فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو کبھی کبھی یاد فرماتی رہیے۔

آپ کا قصوروار

"دل گرفتہ"

مذکورہ بالا خط کی روشنی میں یہ خیال کرنا کہ قمر زمانی سے ملاقات کے بعد شاہ دلگیر کا راز فاش ہو گیا درست نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک مدت تک نہیں سمجھ سکے کہ انہیں جل دیا جا رہا ہے۔

شاہ دلگیر کا یہ خط ۱۵ر نومبر ۱۹۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد سیکڑوں خط آئے گئے بڑے دلچسپ خطوط ہیں لیکن اس دلچسپ داستان کے پھیلانے کا یہ موقع نہیں، صرف ۱۰ر فروری ۱۹۱۷ء کے ایک خط کی چند سطریں دیکھیے، یہ خط قمر زمانی بیگم کا ہے اور اس میں نقاد کو دوبارہ جاری کرنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

"نقاد کی دوبارہ زندگی میری محبت کی یادگار رہے۔ اس لیے اس یادگار رشتے کا واسطہ دلاتی ہوں کہ اسے ضرور جاری فرمائیے اپریل کے پہلے ہفتے میں پرچہ میرے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور یہی امتحان محبت ہے۔ اڈیٹ کرنے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے کچھ آئے نہ آئے آپ پر اعتماد ہے سنبھال لیجئے گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے نام کے ساتھ میرے نام کا بھی اعلان کر دیجئے لیکن پتہ ظاہر نہ کیجئے۔"

اس کے جواب میں بھی شاہ دلگیر کے ایک طویل خط کا اقتباس بھی دیکھتے چلیے۔

"مطمئن رہیے آپ کی محبت کی یادگار نقاد اپریل کے پہلے ہفتے میں آپ کے دست مبارک میں ہوگا میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ امتحان میں پورا اترا تو انعام کیا ملے گا، ابھی فیصلہ سنا دیجئے۔ خوش ہوں کہ آپ نے اس کی ادارت منظور فرمائی۔ اب پہلے پرچے کے لیے افتتاحیہ بہ واپسی مرحمت فرمائیے آپ ہی کے مبارک نام سے بسم اللہ کی جائے۔

ہائے اس نامے کی خوش عنوانیاں
ابتدا ہو جس کی تیرے نام سے

لوح پر آپ کا نام کس طرح اور کس عنوان سے ظاہر کروں، صاف صاف لکھئے اور جلد۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اب نقاد صرف آپ ہی کے نام سے موسوم رہے کہ اس میں چار چاند لگ جائیں لیکن کیا پورا نام ظاہر کر دیا جائے ہائے یہ مجھ سے نہ ہو گا۔" ۲۲ر فروری ۱۹۱۷ء کے خط کا اقتباس آخر میں بھی دیکھیے جو قمر زمانی بیگم نے دلگیر کو بریلی سے ۳ر مارچ کو لکھا:

"مجھے یہ سن کر بہت مسرت ہوئی آپ محض میری خاطر سے نقاد کی اشاعت کی زحمت گوارہ کر رہے ہیں کس زبان سے شکریہ ادا کروں، آپ انعام طلب کرتے ہیں مجھ غریب کے پاس کیا ہے، ایک دل تھا سو وہ کب کا خون ہو گیا۔ آنکھوں سے بہہ گیا، آپ افتتاحیہ مضمون مجھ سے مانگتے ہیں لیجئے حاضر ہے۔"

قمر زمانی کا افتتاحیہ پہنچا تو شاہ دلگیر نے اپنے محب خاص نیاز صاحب کو ایک خط میں لکھا۔

"محب جلیل!

نوازش کارڈ ملا۔ اب میں اسی خیال پر قائم ہوں اور خدا نے چاہا تو آخر مارچ تک نقاد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لطیف صاحب کے مکان پر آپ نے اس کا جو مسودہ طلب فرمایا تھا مجھے منظور ہے۔ جب ارشاد ہو بذریعہ ڈاک ارسال کر دوں، یا آپ مضمون بذریعہ وی۔ پی ارسال کر دیں مگر جلد کیونکہ پہلے نمبر میں اسے ہی دینے کا ارادہ ہے / مانی صاحب کی نظم نہیں ملی جلد ارسال فرمائیے۔

افتتاحیہ نقاد کے نشاۃ ثانیہ کے لیے آگیا ہے، جو برغرض ملاحظہ روانہ کرتا ہوں، مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس مقابلے میں افتتاحیہ لکھ سکوں اس لیے یہ کام آپ کو اور صرف آپ کو کرنا ہوگا کہ میری طرف سے افتتاحیہ لکھ دیجئے جس میں ان کی تعریف ان کی شان کے موافق ہو جائے، واقعہ کا علم آپ کو ہے۔
میں ممنون ہوں گا اگر آپ افتتاحیہ جواب کے ساتھ ارسال فرمائیں گے، ورنہ آخر مارچ تک پرچہ شایع نہ ہو سکے گا اس کا خیال رہے۔ اگر آپ حسب منشا افتتاحیہ لکھ دیں گے تو مدۃ العمر شرمندہ احسان رہوں گا۔ دیکھئے کتنی اچھی خدمت آپ کے سپرد کی ہے۔
عارف صاحب کا خط آیا ہے، مضامین دینے کا وعدہ کیا ہے۔ خلیق بھی لکھ رہے ہیں، رؤف کو اب لکھتا ہوں آپ بھی ان کو لکھ دیجئے یہ افتتاحیہ جو بھیج رہا ہوں، نقاد کی اشاعت سے پہلے کسی پر ظاہر نہ کیجئے۔"

یہ خط ۱۰ رمارچ ۱۹۱۷ء کا ہے، اس کے بعد نیاز صاحب نے دلگیر صاحب کی فرمائش کے مطابق قمر زمانی کے افتتاحیہ پر "افتتاح افتتاحیہ" لکھ بھیجا، افتتاحیہ اور "افتتاح افتتاحیہ" دونوں نیاز کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کی انشاء پردازی کی عمدہ مثالیں ہیں، ایک طرف قمر زمانی کے روپ میں انھوں نے "افتتاحیہ" لکھا، دوسری طرف دلگیر کے رازدار خاص کی حیثیت سے اس کا جواب لکھا، یہ دونوں چیزیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور "نقاد" اپریل ۱۹۱۷ء یعنی نقاد کے دور دوم کی پہلی اشاعت میں شایع ہو چکی ہیں، اس کے بعد جب تک نقاد جاری رہا نیاز صاحب قمر زمانی کے نام سے نقاد کے جوائنٹ مدیر بھی رہے اور برابر کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہے، قمر زمانی کی تحریریں چونکہ چونکا دینے والی تھیں اس لیے عام و خاص سبھی ان کی طرف متوجہ ہوئے معاصر پرچوں میں، نقاد کے دوبارہ اجرا پر تبصرے ہوئے قمر زمانی کو ان کی تحریروں پر ہر طرف سے داد ملی، لیکن کچھ دنوں بعد ہر طرف سے یہ سوال اٹھا کہ قمر زمانی بیگم کون ہیں؟ اور کہاں ہیں؟، بعض ادیبوں کو ان کے وجود پر شبہ ہونے لگا، ادھر قمر زمانی بیگم نے دلگیر سے ملاقات کرنے اور ان کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کا جو وعدہ کر رکھا تھا، وہ بھی پورا نہ کر سکیں، دلگیر اس کے بعد ایک بار بریلی بھی قمر زمانی سے ملنے گئے لیکن ناکام واپس ہوئے، نتیجتاً دلگیر بھی قمر زمانی کی طرف سے حد درجہ ناامید و دل گرفتہ رہنے لگے۔ دلگیر نے جن احباب کو اپنا رازدار بنا رکھا تھا وہی۔ قمر زمانی کو دلگیر کی محبوبہ بنائے ہوئے تھے۔ نتیجتاً ہزار پردہ داری کے باوجود تقریباً دو سال بعد یہ راز فاش ہو گیا اور دلگیر کے لیے ان کے دوستوں کی یہ دلچسپ شرارت زندگی کا المیہ بن گئی۔

احسان اللہ

انڈین وٹرنری جرنل

بمبئی وٹرنری کالج کی لائبریری میں ایک پرانے انگریزی مجلد رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ خوشگوار تعجب ہوا کہ اس وقت کی بلا مایہ اور کس مپرس اردو زبان میں اس وقت یعنی ۱۹۱۰ء میں وٹرنری سائنس (علاج حیوانات) پر ایک مکمل رسالہ شائع ہوتا تھا جو انگریزی زبان کے رسائل کی صف میں شامل تھا۔

زیر تذکرہ مجلد رسالہ کی پشت پر انگریزی میں انڈین وٹرنری جرنل اور II (یعنی دوسری جلد) کندہ ہے۔ جلد الٹنے کے بعد سادہ مگر کرم خوردہ سفید کاغذ پر بمبئی وٹرنری کالج کی مہر ہے اور تاریخ داخلہ ۲۳ر فروری ۱۹۱۲ء درج ہے (بمبئی وٹرنری کالج ہندوستان کا سب سے پہلا وٹرنری کالج ہے جس کا آغاز ۱۸۸۶ء میں ہوا تھا)

اس کے بعد نہ ہی ٹائیٹل پیج ہے اور نہ ہی فہرست مضامین، فوراً ہی اڈیٹوریل شروع ہو جاتا ہے۔ غالباً جلد بناتے وقت ٹائیٹل کا صفحہ نکال دیا گیا ہے۔

اداریہ کے دوسرے پیراگراف کا ترجمہ حسب ذیل ہے "اس اڈیشن کی اشاعت کے ساتھ اردو اڈیشن کے تیسرے سال کا آغاز ہوتا ہے جبکہ انگریزی اڈیشن کے صرف دوسرے سال کا۔ اردو اور انگریزی مضامین کے انعامات کے تعلق سے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ اردو کا پہلا انعام وٹرنری گریجویٹ کرم الٰہی کو ان کے بہترین اور مکمل مضمون "گھوڑے کی بیماری" پر پیش کروں۔ انگریزی انعام کا قطعی تصفیہ ابھی نہیں کیا گیا ہے۔ جلد ہی اس سلسلے میں اعلان کیا جائے گا۔

اس رسالہ کو دیکھنے سے اس کی تاریخ اشاعت اور مقام اشاعت کا قطعاً کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اڈیٹر کون ہیں البتہ اداریہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلے یہ رسالہ اردو میں شائع ہوتا تھا۔ دوسرے سال سے انگریزی اڈیشن بھی نکلنے لگا۔ نیز اچھے مضامین پر انعامات بھی دیئے جاتے تھے۔

اس کے بعد بیاسی صفحات پر مشتمل پہلا شمارہ ہے جس میں چوبیس[۲۴] مضامین تہتر صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بقیہ اشتہارات ہیں۔ ان میں سے پانچ مضامین جو گیارہ صفحات پر گئے ہیں مضمون اور مضمون نگار کے بعد تیسری سطر میں قوسین میں درج ہے "اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا"۔

یہ پانچ مضمون اور مضمون نگار حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ڈسٹمپر (چیچک کا رکنا)، از محمد عبداللہ وٹرنری اسسٹنٹ لائل پور۔

۲۔ مختلف جانوروں کی قدرتی عمر اور ان کے ایک جھول میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد از محمد روشن خاں فاضل ایر کلاس پنجاب وٹرنری کالج۔

۳۔ گھوڑے کی جلد پر پیلا غین (سیاہ دھبے) کا جمع ہونا قدرتی ہے از محمد روشن خاں۔

۴۔ سانس کی نالی میں بیرونی اجزاء از جی جی مبولکر وٹرنری اسسٹنٹ یونائیٹڈ پراونس۔

۵۔ سالمجاتی نسخے از محمد عبداللہ وٹرنری اسسٹنٹ لائل پور

اس جلد میں دوسرے شمارے کے اڈیٹوریل سے کہیں پتہ چلتا ہے کہ اس کے اڈیٹر ڈبلیو۔ او۔ ڈاسن ہیں جس پر تاریخ ۲۴ر جنوری ۱۹۱۱ء ہے اور یہ کہ رسالہ مدراس سے نکلتا تھا جو اس زمانے میں بھی تجارت اور ساتھ ہی ساتھ علم کا بھی (مدراس یونیورسٹی کی وجہ) بڑا مرکز تھا۔ اس میں بھی کئی مضامین اردو سے ترجمہ شدہ ملتے ہیں۔ قابل تذکرہ مضمون گوبند سرن بھٹناگر وٹرنری اسسٹنٹ سنٹرل پراونس کا (choking) (دم گھٹنا) پر ہے۔ یہ مضمون اور پہلے شمارہ میں جی جی مبولکر کا مضمون اردو کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہونے کی دلالت کرتے ہیں

تیسرے اور چوتھے شمارے میں بھی اردو سے ترجمہ کئے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔

تیسرے شمارہ کے اداریہ میں ہم پیشہ افراد کے عدم تعاون اور کچھ دوسری مزاحمتوں کی شکایت کرتے ہوئے ڈبلیو او ڈاسن لکھتے ہیں کہ شاید انھیں رسالہ بند کرنا پڑے۔

اسی شمارہ میں ایف۔ ایچ۔ ایس بالڈرے کی بیکٹریالوجی پر ریویو کرتے ہوئے ڈاسن صاحب بالڈرے صاحب کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ پیتھالوجی پر بھی کوئی کتاب لکھیں اور اس کے ترجمہ کی طرف بھی توجہ کریں کیونکہ کسی موزوں کتاب کو عدم دستیابی کی وجہ پنجاب وٹرنری کالج لاہور کے طلبہ کو (جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے) کافی دقت ہو رہی ہے۔

چوتھے شمارے میں کسی قدر تلخ طرز تحریر میں ڈاسن لکھتے ہیں کہ "یہ انگریزی انڈین وٹرنری جرنل کا آخری شمارہ ہے" ساتھ ہی وہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ اردو اڈیشن شائع ہوتا رہے گا انھوں نے ہم پیشہ افراد سردار حق نواز، محمد عبداللہ اور محمد حسن علی صاحبان کی کوششوں کو جو اردو اڈیشن جاری رکھنے کے سلسلے میں تھی بہت سراہا ہے۔ حسن علی صاحب کے متعلق ڈاسن صاحب کی رائے ہے "ایک خدمت گزار جو بہترین اردو جانتے ہیں ساتھ ہی اردو اور انگریزی کے بہترین اسکالر بھی"

بہر حال پورے مجلہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ انڈین وٹرنری جرنل اردو انگریزی زبان میں نکلتا تھا۔ ڈاسن صاحب دونوں اڈیشنوں کے نگران یا اڈیٹر تھے۔ ہندوستان بھر سے وٹرنری ڈاکٹر اردو یا انگریزی میں مضامین بھیجتے تھے۔ اچھے مضامین منتخب کئے جانے کے بعد ان دونوں اڈیشنوں میں شائع کئے جاتے تھے۔

------ ❀ ------

مراسلہ

امانت کی اندر سبھا کے بارے میں

یکم نومبر اور ۸ نومبر ۱۹۶۶ء کے ہماری زبان میں "امانت کی اندر سبھا" کے عنوان سے ڈاکٹر سید محمد عقیل کا ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اگرچہ عنوان میں اس کی صراحت نہیں کی گئی لیکن نفس مضمون سے معلوم ہوا کہ یہ امانت کی اندر سبھا مرتبہ پروفیسر مسیح الزماں سے متعلق ہے۔ جن شواہد کو فاضل مرتب نے مقدمے میں رد کر دیا ہے انھیں سے ان کے بیانات کی تردید کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔

آج کل ایک رواج یہ ہو گیا ہے کہ کسی کتاب یا تحریر کو اعتراض کرنے کے لیے اٹھایا اور بغیر سوچے سمجھے حوالوں اور اقتباسات کی بھرمار کر دی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ معترض بڑا قابل آدمی ہے لیکن مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔ خام مواد کی پیش کشی میں نکتہ شناسی اور اصابت رائے کا دور دور پتہ نہیں چلتا حالانکہ ان کے بغیر تحقیق ایک بے معنی طومار معلومات سے آگے نہیں بڑھتی۔ کسی موضوع پر مواد حاصل کرنے سے کہیں زیادہ اہم اس سے صحیح نتیجہ نکالنا ہے۔ بقول اقبال

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن　　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ڈاکٹر سید محمد عقیل کا یہ کہنا کہ اندر سبھا سے پہلے یہ ڈراما لکھا گیا وہ تعزیہ موجود تھا۔ لکھنؤ کے محل شاہی میں جلسے والیوں کے مجرے اور پریوں کے رہس ہوتے تھے واجد علی شاہ نے رادھا کنھیا کا قصہ لکھا تھا۔ مسیح الزماں صاحب عوامی ڈراموں اور شمالی ہندوستان میں ڈرامے کی روایت پر گفتگو کر رہے ہیں اور ڈاکٹر سید محمد عقیل ان کی تردید میں بمبئی اور کلکتہ سے ثبوت لا رہے ہیں۔ مسیح الزماں صاحب نے اندر سبھا کی نوعیت کو مدنظر رکھ کر اپنے گرانقدر مقدمے میں شمالی ہند میں اردو ڈراما کی ابتدا اور اندر سبھا کے متعلق بڑا بصیرت افروز محاکمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نکتہ دانی اور گہرائی سے بہرہ یاب نہیں ہو سکے۔ یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسیح الزماں صاحب اردو ڈراما کے متعلق موجودہ تحقیق کی موٹی موٹی باتوں سے واقف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نامی کی تحقیق کے متعلق جب خود مضمون نگار کے یہ الفاظ ہیں کہ "ڈاکٹر نامی نے ڈراموں کے یہ نام اور تفصیلات کہاں سے اکٹھا کیں اگر ان کے حوالے مکمل یا اقتباسات کے ہوتے تو بہتر ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔" تو پھر مسیح الزماں صاحب پر اعتراض کرنے کے لیے ان کا سہارا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی صورت میں اور بھی جبکہ اندر سبھا کے مقدمے میں مسیح الزماں صاحب نے ڈاکٹر نامی کی تحقیق کو پیش کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ مسیح الزماں صاحب نے لکھا ہے۔

> "ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے "راجہ گوپی چند اور جلندھر" کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیا ہے جس کے مصنف بھاؤ داجی لاڈ تھے یہ ڈراما بمبئی میں ہندو ڈرامیٹک کور نے ۹ نومبر ۱۸۵۳ء مطابق ۱۳ صفر ۱۲۷۰ھ کو پہلی بار کھیلا تھا[۱]۔ اس ڈرامے کی نہ انھوں نے کہانی بیان کی ہے نہ کوئی اقتباس پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ یہ اردو میں تھا بھی یا نہیں۔
>
> بہرحال اگر یہ اردو کا ڈراما ہو اور اس کی پیش کش کی تاریخ کو صحیح مان لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پیش کش میں راجہ گوپی چند اور جلندھر کو تقدم حاصل ہے یعنی یہ اندر سبھا سے تقریباً دو [illegible] پہلے کھیلا گیا۔ پھر بھی اندر سبھا کو سال تصنیف کے اعتبار سے اولیت حاصل رہے گی۔"

مضمون نگار نے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق اور اقوال بھی اس طرح درج کیے ہیں جیسے مسیح الزماں صاحب کو ان کا علم نہیں ہے حالانکہ ان کے بارے میں بھی انھوں نے بڑی سنجیدگی اور احتیاط سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس کو شاید اس لیے قابل توجہ نہیں سمجھا کہ اس میں بزرگوں سے اختلاف رائے کا کوئی نامناسب طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اس جگہ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح الزماں صاحب کے مقدمے کا ضروری اقتباس درج کر دیا جائے تاکہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ واجد علی شاہ اور رقص و موسیقی سے ان کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "مزاج کی حسن پرستی طبیعت کی نفاست موسیقی و رقص کا ذوق اختراع کا مادہ فرصت اور روپے کی فراوانی نے پہلے تو انھیں اس عوامی رقص کی بہت سی قسمیں ترتیب دینے کی طرف متوجہ کیا جسے رہس مبارک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھر اس کے لیے رہس خانہ تعمیر ہوا۔ رہس میں ناچنے گانے کے لیے نوجوان لڑکیاں اور ان کے تعلیم دینے والے ملازم ہوئے اور یہ شوق مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا اس جگہ پہنچا کہ بادشاہ کی طبع نے رادھا کنھیا کا قصہ کے نام سے ایک ایسی چیز تصنیف کی جو کرشن لیلا اور ڈرامے سے ملتی جلتی تھی۔"

اس طرح یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اندر سبھا کا قصہ امانت کا اپنا نہیں ہے مضمون نگار نے خاصا طول دیا ہے حالانکہ مقدمے میں اس کا ذکر بھی موجود ہے کہ امانت نے اس قصے کو مختلف ماخذ قصوں سے لیا ہے۔ مقدمے کی عبارت ہے۔

> "اس قصے میں سحر البیان، گلزار نسیم اور بعض دوسرے قصوں کے اجزا اس طرح موجود ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ملا جلا کر امانت نے اندر سبھا کا قصہ ترتیب دیا ہے۔"

ان اقتباسات کی موجودگی کے بعد امانت کی اندر سبھا کے مقدمہ پر مضمون نگار کے اعتراضات کی صحت کا اندازہ پڑھنے والے خود لگا سکتے ہیں۔ جب اعتراضات کی بنیاد ہی غلط ہو تو ان کی تائید میں جو دلیلیں دی گئی ہیں ان سے بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن مضمون نگار کے معیار تحقیق کا ایک نمونہ پیش کر دینے سے غالباً قارئین "ہماری زبان" کا وقت ضائع نہ ہوگا۔ مضمون کی دوسری قسط میں ہادی علی بیخود کے کلیات کا ذکر ایک ہی صفحہ پر تین جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ اس کا نام الگ ہے یعنی ایک جگہ "کلیات گلشن بیخود" اور دوسری جگہ "کلیات بہار بیخودی" اور حاشیہ میں "گلزار بے خزاں"۔

(عبدالرشید)

۱؎ اردو تھیٹر جلد اول ص ۱۸۰

انجمن ترقی اردو پنجاب کے اجلاس کی کاروائی

چنڈی گڑھ، گذشتہ روز یہاں انجمن ترقی اردو پنجاب کا ایک اہم اجلاس سردار گیان سنگھ جی راڑیوالہ کی صدارت میں منعقد ہوا اجلاس میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے مسائل پر غور کرنے کے علاوہ اس امر کا پر زور اور متفقہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ پنجاب کے انتظامیہ میں اردو کو مناسب جگہ دی جائے گی۔ نیز درسگاہوں میں ہر سطح پر اردو زبان کی تدریس کا خاطرخواہ انتظام کیا جائے۔

اجلاس میں دوران بحث اس امر کی وضاحت کی گئی۔ کہ ماضی میں طویل عرصہ تک اردو پنجاب کی واحد سرکاری۔ کاروباری اور ادبی زبان رہ چکی ہے۔ اس میں ہمارا قابل فخر ادبی اور درباری لٹریچر موجود ہونے کے علاوہ تمام تر سرکاری ریکارڈ بھی محفوظ ہے۔ اس لیے اردو زبان سے قطعاً لاتعلقی کسی طرح بھی نہ تو مفید ہے۔ اور نہ ہی دور اندیشانہ ہے۔ اس زبان سے اچانک اور یکسر تعلق توڑ لینے کے باعث بے شمار پیچیدگیاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ لہٰذا پنجاب سرکار ریاست میں نیا لسانی فارمولہ مرتب کرتے وقت زبان کے سلسلہ میں پیدا شدہ مسائل کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے اور فراخدلی کے ساتھ اس مظلوم زبان کی دادرسی کرکے اسے پنجاب میں موزوں درجہ عطا کیا جائے تاکہ گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو سکے۔

اجلاس میں متعدد قراردادیں پاس ہوئیں۔ جن میں سے چند کا اختصار درج ذیل ہے۔

(۱) پنجاب کے محکمہ لسانیات سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ
ا۔ محکمہ میں اردو کا مکمل شعبہ قائم کرکے اس کے لیے خاص اور مناسب رقم منظور کی جائے۔
ب۔ اردو تصانیف کے دیگر زبانوں میں یا دوسری زبانوں سے اردو میں تراجم انجمن کی وساطت سے کرائے جائیں۔

(۲) آل انڈیا ریڈیو جالندھر سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ
ا۔ ریڈیو کی مشاورتی کمیٹی میں انجمن کا نمائندہ لیا جائے۔
ب۔ اردو پروگراموں کی مزید بہتر اور مفید بنانے کے علاوہ اردو پروگراموں کو وسعت دی جائے۔
ج۔ اردو ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور مصنفوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۳) پنجاب سرکار سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ
ا۔ اسکولوں میں ہر سطح پر اردو زبان کی تدریس نیز اردو کے اساتذہ کی تربیت کا خاطرخواہ انتظام کیا جائے۔
ب۔ سرکاری ملازمین کے لیے کم از کم مڈل تک اردو جاننا لازمی قرار دیا جائے۔
ج۔ ہر محکمہ میں اردو کی درخواستیں قبول کرنے اور ان کے جوابات اردو میں دینے کا اہتمام کیا جائے۔
د۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کی مالی امداد کے لیے مناسب سالانہ رقم منظور کی جائے۔

(۴) مرکز سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ
ا۔ چنڈی گڑھ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم رائج کی جائے۔

(۵) پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی طرف سے اردو کو بھی امتحان کا ذریعہ قرار دئے جانے پر یونیورسٹی کا شکریہ ادا کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا۔ کہ اس فیصلے پر مستقل عمل کرنے کے علاوہ اردو کی جانب مزید توجہ دی جائے۔

علاوہ ازیں اردو دوستوں کی تنظیم کو مضبوط اور موثر بنانے کے لیے کئی دیگر مفید فیصلے بھی کئے گئے۔

انجمن نے اردو کے تمام بہی خواہوں سے پر زور اپیل کی ہے کہ وہ اپنی محبوب زبان کے تحفظ اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے میدان میں آکر انجمن کو اپنا سرگرم تعاون پیش فرمائیں۔ اجلاس میں عنقریب پٹیالہ کے اندر اردو دوستوں کی ایک عظیم کنونشن بلانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

(سورج تنویر جنرل سکریٹری انجمن)

جموں میں انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کا قیام

جموں میں آج تک انجمن کی کوئی شاخ نہ تھی۔ اس کمی کو دیکھتے ہوئے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے مرکزی انجمن کے ممبر ڈاکٹر گیان چند پروفیسر اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی جموں کو اختیار دیا کہ وہ جموں اور ریاست کے دوسرے مقاموں میں انجمن کی مقامی شاخیں قائم کرانے کے لیے مناسب اقدام کریں۔ جموں میں انجمن کی مقامی شاخ قائم کر دی گئی ہے جس کے سکریٹری ظہورالدین صاحب اور صدر جناب چیت رام چوپڑہ مقرر کئے گئے ہیں۔ چوپڑہ صاحب ایک زمانے میں جموں کے گورنر رہ چکے ہیں اور شہر کے نہایت موقر شہری ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ اردو کے بڑے سرگرم شیدائی ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں اور اس کے بعد چند سال تک آپ بھوپال میں مرکزی حکومت کے افسر بجلیات رہے ہیں اور اس زمانے میں حمیدیہ کالج بھوپال کی بزم ادب میں غالب کی شاعری پر تقریر کر چکے ہیں۔

اپنے قیام کے ساتھ ہی شاخ جموں نے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شام کی جماعتیں جاری کرانے کے لیے چانسلر، پرو چانسلر اور وائس چانسلر کو ایک یادداشت دی۔ انجمن کے سکریٹری نے اس سلسلے میں مختلف ادبی انجمنوں کا تعاون حاصل کیا اور صدر چوپڑہ صاحب نے چانسلر ڈاکٹر کرن سنگھ سے ملاقات کی۔ شام کی جماعتوں کا اجرا، انجمن کی پہلی کامیابی ہے۔ جموں میں انجمن کی ممبر سازی زور و شور سے ہو رہی ہے امید ہے جنوری میں مستقل عہدہ داروں اور ضلع

کی شاخ کے اراکین کا انتخاب عمل میں آجائے گا۔ پونچھ اور کٹھوعہ میں بھی انجمن کی شاخیں قائم کرانے کے لیے کارروائی کی گئی ہے۔

(سکریٹری انجمن ترقی اردو جموں)

سنام میں انجمن ترقی اردو کا قیام

سنام میں آج یہاں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل آیا۔ مقامی ادب دوست حضرات میونسپل پارک میں جمع ہوئے اجلاس کی صدارت مشہور اور بزرگ شاعر جناب دیویندر ساگر نے فرمائی ان کے علاوہ جناب رادھورام بھلا، جوگندر جوہر، راجندر راز، مہندر ممتاز، ہردیپ چلک، کالی چرن داس اور دیگر حضرات موجود تھے۔ ڈسٹرکٹ آرگنائزر مہر چند کوثر نے انجمن کے قیام کی غرض و غایت بیان کی اور پنجاب میں اردو کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ انجمن کا اگلا اجلاس اس ہفتہ ہوگا۔

(ڈسٹرکٹ آرگنائزر)

کارپوریشن میں اردو کا محکمہ الگ قائم کرنے کا مطالبہ

دہلی کارپوریشن کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کارپوریشن کے ممبر جناب محمد شریف صاحب نے کہا کہ غریب اردو کا جو کچھ حال یہاں ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہر اسکول میں یہ شکایت عام ہے کہ اردو پڑھانے والے ماسٹر اور استانیوں کا کال ہے جب اوپر معلوم کیا جاتا ہے کہ ماسٹر اور استانیاں کیوں نہیں بھیجتے۔ تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس انتظام نہیں ہے۔

افسران بالا نے اردو کا معیار اتنا بلند کر رکھا ہے کہ کوئی پاس ہو ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ اردو دہلی سے ختم ہو جائے۔ کتابیں نہیں ملتی کورس میں وہ کتابیں لگائی جاتی ہیں جو کہ ناپید ہیں میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے۔ محکمہ تعلیم یا کمشنر اردو کا جو حال انھوں نے تباہ کیا ہے۔ اس کی دو تین مثالیں اور سن لیجئے۔ میرے علاقے میں کٹہرہ عالم بیگ ہے جس کو الیف سے آکم بیگ لکھا ہے اور احاطہ کالے صاحب کو احاتہ کالیصاحب اور حویلی حسام الدین میں لکڑو خانہ ہے جس کو لکڑ خانہ لکھا ہے جب ایسے لکھنے والے یہاں موجود ہوں گے تو اردو کا خدا ہی حافظ ہے چیرمین صاحب نے کہا کہ ابھی دلی میں اردو داں کی کمی نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا جائے کہ اردو کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اردو کو دہلی کے صفحہ ہستی سے ناپید کر دیں اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اردو کا محکمہ بالکل الگ ہونا چاہئے اور اس میں بھی اردو جاننے والے لوگ ہوں ورنہ بہتر ہے کہہ دیا جائے صاف صاف کہ ہم اردو کو برداشت نہیں کرتے جو کہ جن سنگھی اور فرقہ پرستوں کا نعرہ ہے۔

درجہ ششم سے درجہ ہشتم تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا حکم جاری نہیں ہوا

لکھنؤ ایوان اسمبلی کے وقفہ سوالات میں ایک ممبر کے ایک سوال کا تحریری جواب دیتے ہوئے وزیر تعلیم نے بتایا کہ حکومت نے حال میں درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے کا کوئی حکم جاری نہیں کیا انھوں نے کہا کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے لیے حکومت نے اردو میں کتابیں چھپوانے کا انتظام کیا ہے جہاں اردو کی کتابیں چھاپی جاتی ہیں اور جہاں سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں ان کی فہرست بھی انھوں نے پیش کی اور کہا کہ اردو اداروں سے اردو کی کتابیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

(الجمعیۃ)

مدھیہ پردیش میں اردو کے ساتھ حکومت کی ناانصافیاں

بھوپال گذشتہ روز علوم شرقیہ کے طلبہ کی ایسوسی ایشن کے وفد نے حکومت ہند کے لسانی اقلیتوں کے کمشنر جناب وی ایس باجپئی سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ان شکایتوں کے سلسلہ میں ایک میمورنڈم پیش کیا جو ریاست میں اردو زبان بولنے والوں کو ہیں۔ ایسوسی ایشن کے وفد نے جناب باجپئی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ امسال ہائر سکنڈری اسے کوامس کے امتحانات میں اگرچہ میڈیم ہے مگر بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے فیصلہ کیا ہے کہ امسال امتحانات کے پرچے اردو میں شائع نہ کیے جائیں اور یہ پرچے صرف ہندی اور انگریزی دو زبانوں میں شائع کیے جائیں۔ لسانی کمشنر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی کہ ہائر سکنڈری میں ہندی ایک لازمی مضمون نہیں ہے اور بورڈ کے ضوابط کی رو سے ایک ایسا امیدوار بھی امتحان میں شریک ہو سکتا ہے جس نے ہندی کا ایک لفظ بھی نہ پڑھا ہو۔ ایسی صورت میں پرچے شائع کرنے کے لیے محض ہندی اور انگریزی کا استعمال قرین انصاف نہیں۔

جناب باجپئی نے دوران گفتگو حکومت اور بورڈ کی اس معذوری پر روشنی ڈالی کہ اب وقت نہیں ہے اور امتحان میں اتنا کم عرصہ رہ گیا ہے کہ پرچوں کا دوسری زبان میں ترجمہ اور پھر ان کی اشاعت ممکن نہیں رہی تو ان کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کی گئی کہ گذشتہ سال طلبہ کے ہنگاموں کے بعد امتحانات ملتوی ہو گئے تھے اور بورڈ نے صرف ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں بطرف یہ کہ پرچے ازسرنو مرتب کئے تھے بلکہ اردو سمیت تمام زبانوں میں ان کی اشاعت کا انتظام کیا تھا۔

جناب باجپئی وفد کے ان دلائل سے متاثر نظر آتے تھے۔ انھوں نے اردو بولنے والوں کی شکایات کو غور سے سنا اور ان کے ازالہ کے لیے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔ علوم شرقیہ کے طلبہ کے نمائندہ وفد نے باجپئی کو اس جانب بھی متوجہ کیا کہ بھوپال کے کسی بھی سرکاری اسکول میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر تعلیم دینے کا انتظام نہیں ہے جبکہ ہر اسکول میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد ہے اور بعض اسکولوں میں تو ایسے طلبہ پچاس فیصد سے زیادہ تعداد میں ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت

سے اختیار کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جناب باجپئی نے ان حقائق پر تعجب کا اظہار کیا اور وفد سے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں اعداد و شمار جمع کر کے ان کے پاس بھیجے۔ طلبہ کی ایسوسی ایشن کے اس وفد سے قبل بھوپال کے کمیونسٹ ایم۔ ایل۔ اے خان شاکر علی خاں نے بھی لسانی کمشنر سے ملاقات کی اور ان کو مذکورہ بالا مسائل کی جانب متوجہ کیا۔ انھوں نے جناب باجپئی کے سامنے ایسے طلبہ کے نام پیش کیے جو ہائر سکنڈری کے امتحان میں شریک ہونے کے خواہشمند ہیں۔ انھوں نے فارم پر کر دیے ہیں جبکہ وہ ہندی زبان سے قطعی نابلد ہیں۔ جناب باجپئی نے شاکر علی خاں صاحب کے دلائل کو بھی غور سے سنا اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ جناب ڈی ایس باجپئی بھوپال کا اپنا دورہ مکمل کر چکے تھے اور وہ اس دورہ کے بعد اپنے بھائی کے یہاں آرام کر رہے تھے لیکن انھوں نے اپنے اس آرام کے وقفہ میں بھی ان ملاقاتوں کے لیے وقت نکال لیا۔

طلبہ کی ایسوسی ایشن کا وفد جناب عبد الرقیب ایڈوکیٹ جناب رشید قریشی، ڈاکٹر قیوم جاوید اور جناب جمیل احمد پر مشتمل تھا۔

(دعوت)

پنجابی یونیورسٹی کا ایک مستحسن فیصلہ

چنڈی گڑھ۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی سینیٹ نے اپنے ایک اجلاس میں دیگر فیصلہ جات کے ساتھ اردو زبان کو ذریعہ امتحان کے طور پر تسلیم کرنے کا قابل تحسین فیصلہ بھی کیا ہے۔ اس فیصلہ کے مطابق آئندہ طلبہ امتحانات میں جواب مضمون کے لیے اردو کو بھی استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔ قبل ازیں پنجابی یونیورسٹی میں ذریعہ امتحان کے طور پر صرف پنجابی، ہندی اور انگریزی کے استعمال کی ہی اجازت تھی اب ان میں اردو بھی شامل کر لی گئی ہے۔

یونیورسٹی نے ڈھائی لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک پنجابی بھون بنانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ نیز یونیورسٹی کے احاطہ میں اٹھارہ پنجابی شعرا، ادبا اور مصنفین کی تصاویر آویزاں کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ جن میں سید وارث شاہ۔ شاہ محمد، جناب شہاب الدین اور بابو فیروز الدین شرف بھی شامل ہیں۔ (سوورج تنویر)

اردو کو ملک میں اس کا جائز مقام دینے کا مطالبہ

ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس کی تجاویز

نئی دہلی۔ ترقی پسند مصنفین کی چھٹی آل انڈیا کانفرنس نے اپنے مینی فیسٹو میں واضح کیا ہے کہ اس کے اقدامات دو طرفی ہوں گے ایک طرف تو یہ اپنے عظیم دیسی کلچر کو محفوظ کرے گی۔ دوسری جانب اسے دنیا کے انتہائی انسانی کلچر میں ترقی دینے کی کوشش کرے گی۔

اخباری نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے کانفرنس کے جنرل سکریٹری جناب سید سجاد ظہیر نے کہا کہ کانفرنس نے یکم جنوری کو ایک تجویز پاس کی تھی کہ اردو کو اس کا جائز مقام ملک میں ملنا چاہیے کانفرنس نے حکومت کو سفارش پیش کی تھی کہ جن لڑکوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم اسی زبان میں ملنا چاہیے اور ریاستی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے۔

کانفرنس نے تجویز پیش کی تھی کہ ایشیائی استحکام کی نشانی کے طور پر مصنفین کو ویٹ نام بھیجنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ویٹ نام کی جنگ کا جائزہ لیں کیونکہ متحدہ امریکہ کی مسلسل جارحیت نے مصنفین کو مجبور کیا ہے کہ وہ اندیشہ محسوس کریں۔

(الجمعیۃ دہلی)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا